قرآن عزیز کی جلالتِ شان

اور حضور ﷺ کا فطری تأثر

مولانا سید اخلاق حسین قاسمی دہلوی

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ (الحشر : ۲۱)

"یہ قرآن عزیز اگر ہم نے کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) تم دیکھتے کہ وہ (پہاڑ) اللہ تعالیٰ کی ہیبت سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں"۔

اس آیت کریمہ کے اسلوب پر غور کیجئے۔ ذکر قرآن کریم کے نازل کرنے کا ہے اور اس کے نزول سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے خوف کا اثر بیان کیا جا رہا ہے۔ یعنی "مِنْ خَشْيَةِ القرآن" کی جگہ "مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ" کہا گیا ہے۔ اسلوب کی یہ تبدیلی بتا رہی ہے کہ قرآن عزیز اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم یعنی اللہ کی صفت ہے اور صفت میں موصوف کی جلالتِ شان کی جلوہ گری ہے۔ ذاتِ حق تعالیٰ کی یہی جلالتِ شان ہے کہ پہاڑ جیسی عظیم مادی مخلوق اس کے تصور سے پھٹ جاتی اگر یہ کلام اس پر نازل کیا جاتا۔

علامہ ابن کثیر نے یہ شرط لگائی کہ اگر پہاڑوں میں فہم و شعور ہوتا تو ایسا ہوتا : "لو فهم هذا القران فتدبر ما فيه لخشع وتصدع من خوف الله عزوجل" ---- اسی رائے کی پیروی اردو مفسرین نے اختیار کی ---- لیکن سورۃ النور (آیت ۴۱) اور سورۃ الاسراء (آیت ۴۴) سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام مخلوق میں اپنے

© rasailojaraid.com

خالق و مالک کی عظمت و جلالت کا فطری طور پر شعور موجود ہے اور ساری مخلوق اپنے اپنے انداز سے اپنے مالک کی حمد و ثناء میں مصروف ہے۔ علامہ ابن کثیر دمشقی نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے استوانہ حنانہ کا واقعہ نقل کیا ہے اور اسے حدیثِ متواتر قرار دیا ہے (ابن کثیر جلد ۴ ص ۳۴۳)۔ ابن کثیر نے اس واقعہ سے کھجور کے تنے میں ذکرِ الٰہی اور وحیِ خداوندی سے محروم ہونے کا شعور ثابت کیا ہے۔ تعجب ہے کہ علامہ ابن کثیر نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے پہاڑوں میں فہم و شعور کی شرط لگائی ہے اور بعد والے حضرات مفسرین نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے' حالانکہ استوانہ حنانہ کی روایت کو متواتر کہہ کر نقل کرنے کے بعد علامہ ابن کثیر کی اوپر والی رائے محلِ نظر ہو جاتی ہے۔

اس کلامِ حق کا جب پہلی دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ انور پر نزول ہوا تو آپ فطری طور پر کلامِ حق کی جلالت سے متاثر ہوئے۔ یہ تاثر معتبر روایات کے ذریعے احادیث کی کتابوں میں موجود ہے اور وہ لوگ جو کلامِ حق کی جلالتِ شان کا عرفان نہیں رکھتے وہ ان روایات کا انکار کرتے ہیں۔

اعلانِ نبوّت سے پہلے اور اعلانِ نبوّت کے بعد

اعلانِ نبوت سے پہلے' ہونے والے نبی کے علم و عمل کی حالت کیا ہوتی ہے اور اس حالت (قبل اعلان) پر نبی و رسول کے القاب کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور دونوں حالتوں میں کیا فرق ہے---؟

اعلانِ نبوت سے پہلے کی حالت سورۃ الشوریٰ میں بایں الفاظ مذکور ہے :

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾

(الشوریٰ : ۵۲)

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! وحی کے جو تین طریقے اوپر بیان کئے گئے' ان ہی کے مطابق) اسی طرح ہم نے آپ پر اپنے حکم سے روح (وحی) نازل کی' آپ کو اس سے

© rasailojaraid.c

پہلے اس کی خبر نہ تھی کہ کتاب الٰہی کیا چیز ہے اور اس کا بھی پتہ نہ تھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے' لیکن اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں راہ حق دکھاتے ہیں۔ بے شک آپ سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں"۔

منصبِ نبوت پر فائز ہونے اور کارِ نبوت کی ذمہ داری اٹھانے سے پہلے نبی و رسول اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان بالغیب اور توحیدِ الٰہی کے اجمالی شعور وفہم سے آراستہ ہوتا ہے اور اس کے دل ودماغ میں یقین وعرفان اور اس کی عملی زندگی میں اخلاق حمیدہ کی روشنی صاف صاف محسوس ہوتی ہے' اور اہل نظر ہونے والے اس نبی ورسول کے اندر اس کے شاندار مستقبل کا رنگ واثر دیکھ لیتے ہیں۔ اس آیت پاک میں (نبوت سے قبل) ایمان اور کتاب الٰہی کے تفصیلی علم کی نفی کی گئی ہے' حقیقتِ ایمان کی نفی نہیں کی گئی۔ یہ حقیقتِ ایمان وعرفان نبی کو فطری طور پر عطا کیا جاتا ہے' نبی کو پیدائشی طور پر ہی تمام ذہنی اور فکری قوتیں عام انسانوں کے مقابلے میں امتیازی درجہ کی عطا کی جاتی ہیں۔

سورۃ الضحیٰ (آیت ۷) میں قبل از نبوت حالت کو "ضلال" سے تعبیر کیا گیا ہے:

﴿وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى﴾

"اور آپ کو (اللہ تعالیٰ نے) شریعت سے بے خبر پایا تو شریعت کا راستہ بتلا دیا"۔

عربی لغت میں "ضلال" کے مختلف معانی آتے ہیں' جن میں سے ایک معنی گمراہ ہونا ہے۔ یہ مفہوم یہاں مراد نہیں لیا جا سکتا' کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کی زندگی گواہ ہے کہ آپ نے ان چالیس سالوں میں کبھی بت پرستی' اخلاقی برائی اور گناہ کا کوئی کام نہیں کیا' اس لئے اس آیت میں ضلال کے دوسرے معانی مراد لئے جائیں گے۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے مذکورہ بالا آیت (الشوریٰ : ۵۲) کی روشنی میں "ضلال" کا ترجمہ "شریعت سے بے خبر" کیا "دین سے بے خبر" نہیں لکھا' کیونکہ "الدین" سے اصول دین' توحید' آخرت اور نبوت مراد ہوتے ہیں اور نبی ورسول کے اندر دین کے اصولوں کا فطری عرفان موجود ہوتا ہے۔ البتہ شریعت یعنی دین کے تفصیلی احکام ومسائل کا علم اعلان رسالت کے بعد عطا کیا جاتا ہے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب

© rasailojaraid.com

نے اپنے ذوق کے مطابق شریعت کی جگہ محبت کا مفہوم مراد لیا اور یہ ترجمہ کیا : "اس نے آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی"۔ یہی دو بنیادی مفہوم ہیں۔ چنانچہ دوسرے مترجمین نے انہی دو ترجموں میں سے ایک ترجمہ کو اپنایا ہے۔

سورۂ یوسف میں حضور ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا :

﴿وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ﴾ (آیت ۳)

"اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) اس واقعہ کے بیان سے پہلے آپ بے خبر لوگوں میں سے تھے"۔

ان واضح آیات کی روشنی میں اعلانِ نبوت سے پہلے اور اعلان کے بعد کی دونوں حالتوں میں کوئی نہ کوئی فرق تو تسلیم کرنا پڑے گا۔

دونوں حالتوں میں فرق کی نوعیتیں

(۱) عقلی طور پر منطق کی اصطلاح کے مطابق یہ فرق "نبوۃ بِالقُوّہ" اور "نبوۃ بِالفعل" کا ہے۔

(۲) قرآن کریم کی تصریحات (سورۃ الشوریٰ : ۵۲ اور سورۃ الضحیٰ : ۷) کے مطابق یہ فرق اجمال و تفصیل کا ہے۔

یعنی اجمال میں تفصیل سے بے خبری ہوتی ہے --- اور محبت کی تعبیر کے مطابق یہ فرق محبت کی بے قراری سے نکل کر حقیقت کے وصال کی منزل میں داخل ہونے کا ہے۔ اس تعبیر کو جگر صاحب کے اس شعر کی روشنی میں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے ؎

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ!
سن رہا ہوں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

نبوت کے اعلان سے پہلے نبی اپنے روحانی ادراک کے ذریعے حقیقت کا وہ نغمہ سن لیتا ہے جو ابھی ساز کے اندر ہوتا ہے اور اعلانِ نبوت کے بعد وہ نغمہ ساز سے باہر آجاتا ہے اور نبی اپنے حواسِ ظاہری کے ذریعے غیبی حقیقت کو محسوس کر لیتا ہے۔ روحانی ادراک جب ادراک بالحواس کی منزل میں داخل ہوتا ہے تو نبی کے حواس میں ایک انقلابی تاثر پیدا

© rasailojaraid.c

ہوتا ہے۔ اس تاثر کو میر تقی میر کے الفاظ میں بھی سمجھا جاسکتا ہے ؎

ہو گیا اس کو دیکھ حیران دل
بات کرنے کا حوصلہ نہ رہا

نبوت کے بجائے رُشد کا اطلاق

قرآن کریم نے اس امتیازی علم و بصیرت پر نبوت اور نبی کا اطلاق نہیں کیا بلکہ لفظ "رُشد" کا اطلاق کیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا :

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ﴾

"اور ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے اس کی (شان کے مطابق) ہدایت و سعادت سے نوازا تھا اور ہم اس (کی فطری صلاحیت) کو (جو ہم نے ہی تخلیق کی تھی) جاننے والے تھے"۔

© rasailojaraid.

قرآن کریم میں یہ لفظ (رُشد) کئی معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ قرآن کریم میں لفظ رُشد 'غَیّ' کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ اس وقت اس کے معنی ہدایت و راہ روی کے ہوتے ہیں۔

﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرہ : ۲۵۶)

"ہدایت 'گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے"۔

ایک جگہ (الجن : ۲۱) میں ضَرًّا (نقصان) کے مقابلہ میں رَشَدًا آیا ہے۔ یہاں نقصان کے مقابلہ میں نفع اور بھلائی کا مفہوم ہے۔

المومن : ۳۸ میں "سَبِيْلَ الرَّشَادِ" وحی الٰہی اور دین کے راستہ کے معنی میں لایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو "وَلِيًّا مُّرْشِدًا" اسی مفہوم میں کہا ہے :

وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (کہف : ۱۷)

"اور جسے اللہ تعالیٰ ہی بے راہ کرے تو (اے نبی ﷺ) آپ اس کے حق میں کسی راہ پر لانے والے ہمدرد اور دوست کو نہ پائیں گے"۔

قرآن کریم میں سورۃ النساء (آیت ۶) میں رشد کے لفظ کو سفاہت (بے عقلی) کے مقابلہ میں شعور مندی اور ہوشیاری کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.

سورۂ کہف (آیت ٦٦) میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر (علیہما السلام) کے واقعات میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کے پاس وحی کا علم (نبوت کا منصب) تھا اور حضرت خضر کے پاس عِلمِ لدُنّی (خاص علم) تھا اور دونوں علوم کے دائرے الگ الگ تھے۔ عِلمِ لدُنّی سے تکوینی معاملات کا علم اور اسرارِ کائنات کا فہم مراد ہے۔ حضرت موسیٰ خضر علیہ السلام سے عِلمِ لدنّی حاصل کرنے کی غرض سے ان کی خدمت میں بحکمِ الٰہی گئے تھے۔ حضرت خضر کے اس خاص علم کو حضرت موسیٰ نے "رُشد" سے تعبیر کیا ہے:

﴿قَالَ لَهٗ مُوْسٰی هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾

"موسیٰ نے ان سے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے بھی اس دانش کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے؟"

لیکن حضرت موسیٰ خضر علیہ السلام کے اس علم کو برداشت نہ کر سکے، کیونکہ وہ انہیں عِلمِ وحی (قانون الٰہی) کے خلاف نظر آیا، اور چند روز ان کے ہمراہ رہ کر واپس آگئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ تعلیم و تربیت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رشد و ہدایت کے جس عالی مرتبہ پر پہنچایا اس کا تعارف تفصیل کے ساتھ سورۃ الحجرات میں ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔ حضرات صحابہ کو مخاطب کرکے خطاب عام کے ذریعے کہا گیا:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ (الحجرات: ٧-٨)

"(اے لوگو!) اس بات کو سمجھ لو کہ تمہارے درمیان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے جو ہستی موجود ہے وہ) اللہ کا رسول ہے۔ وہ (رسول ہوتے ہوئے) اگر اکثر باتوں میں (بعض دنیوی باتوں کے علاوہ) تمہارے کہنے پر چلے تو تم مشکلات میں پڑ جاؤ (جیسا کہ تم میں سے بعض کمزور ایمان والے، جیسے ولید بن عقبہ یہی خواہش رکھتے تھے)

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

لیکن (اے صحابہ رسول!) تم کو اللہ نے ایمان کی محبت دی اور تمہارے دلوں میں ایمان کو پسندیدہ بنا دیا اور کفر و نافرمانی اور گناہ کی طرف سے تمہارے دلوں میں نفرت پیدا کر دی۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے ہدایت و سعادت والے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی حکمت اور بڑے علم والا ہے"۔

ظاہر ہے کہ جس ذاتِ اقدس کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رُشد و ارشاد کے اس مرتبہ عالی پر پہنچایا اس ذاتِ اقدس میں وحیِ الٰہی کے نزول سے پہلے رشد و سعادت کی روشنی کس اعلیٰ درجہ پر ہو گی اور وحیِ الٰہی کی روشنی سے منور ہونے کے بعد نورٌ علیٰ نور کا کیا حال ہو گا!

اعطاءِ نبوت، پختہ عمر میں؟

اللہ تعالیٰ کی سنّت یہ رہی ہے کہ اس نے نبوت کے لئے اپنی منتخب ہستیوں کو کارِ نبوت اسی وقت سونپا جب ان کی عمر طبعی پختگی کی منزل پر پہنچ گئی۔ نبوت کا کمال انسان کی سعی و کوشش سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ یہ حق تعالیٰ کے اپنے انتخاب اور خاص فضل و کرم سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے ہونے والے نبی و رسول میں شروع ہی سے فکر و عمل کی خصوصیات ظاہر ہونے لگتی ہیں اور وہ بندۂ خاص عام انسانوں کے مقابلے میں جلدی نشو و نما پاتا ہے اور جلدی ہی پروان چڑھتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی سنّت اور اس کا معمول یہی رہا ہے کہ وہ عالمِ اسباب کے مطابق بھرپور جوانی میں اس کی نبوت کا اعلان کرتا ہے اور اس پر وحی نازل کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ

﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (یوسف : ۲۲)

"اور جب وہ پوری قوت کی منزل پر پہنچ گیا تو ہم نے اسے حکمت و دانائی اور علمِ شریعت عطا کیا، اور ہم حسنِ عمل والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں"۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا :

﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (القصص : ۱۴)

© rasailojaraid

"اور جب وہ بھرپور جوانی کی منزل پر پہنچ گیا اور اس کا نشوونما مکمل ہو گیا (جب وہ سنبھل گیا : شاہ صاحب") تو ہم نے اسے حکمت و علم عطا کر دیا اور ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں"۔

بائبل میں ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰ کی عمر چالیس سال تھی (اعمال : ۷۔ ۲۳)

سورۃ الاحقاف (آیت ۵) میں عام انسان کے متعلق کہا گیا :

حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً

"یہاں تک کہ جب وہ (انسان) جوانی پر پہنچ گیا اور اس کی عمر چالیس سال کی ہو گئی"۔

اسی عمر میں عام طور پر انسان کی جسمانی، عقلی اور اخلاقی قوت پختہ ہو جاتی ہے۔ صحیح روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی چالیس برس کی عمر میں نبوت ملی۔

© rasailojaraid.c

نبوت وہبی کمال اور فطری صلاحیت ہے

منطقی اصطلاح کے مطابق ہونے والا نبی ابتدا ہی سے "نبوۃ بالقوۃ" (صلاحیتِ نبوت) سے متصف ہوتا ہے اور نزول وحی کے بعد "نبوۃ بالفعل" کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ منصبِ نبوت کے وہبی ہونے کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو نبوت عطا کرنا چاہتا ہے اسے ابتدا ہی سے نبی بننے کی صلاحیتوں سے نوازتا ہے :

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام : ۱۲۵)

"اللہ ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کس سے اپنی پیغامبری کا کام لے اور کس طرح لے"۔

اسی مفہوم (صلاحیتِ نبوۃ) کے لحاظ سے حضور ﷺ نے فرمایا :

كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْن

"میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم ابھی پانی اور مٹی کے درمیان تھے"۔

اس پیرائے میں حضور ﷺ نے اپنے یقینی نبی ہونے کا اظہار کیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے اعلان کا مطلب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود میں اپنی نبوت کا اعلان کیا :

© rasailojaraid.c

﴿قَالَ اِنِّی عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِی نَبِیًّا﴾ (مریم : ۳۰)

"کہنے لگا: میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا"۔

حضرت عیسیٰ کی یہ گفتگو ماں کی گود میں ان کا معجزہ تھا' جو مخالفین کے الزام کی تردید میں آپ سے صادر ہوا۔ حضرت عیسیٰ نے شیرخوارگی کی حالت میں جو یہ اعلان فرمایا' علماء نے اس کی حسب ذیل تاویلات کی ہیں :

(۱) قرآن کریم کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ مستقبل میں ہونے والے واقعاتِ آخرت کے یقینی ہونے کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ ان واقعات کے لئے ماضی کا فعل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً اَتٰی اَمْرُ اللّٰہِ (النحل : ۱) "قیامت کا واقعہ ہو چکا"---- یعنی یقیناً ہونے والا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے اپنی معجزانہ گویائی میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجھے نبی بنائے گا اور کتاب دے گا اور میں تو اس کا ایک بندہ ہوں۔

(۲) نبوت کا اعلان فطری صلاحیت کے لحاظ سے کیا گیا۔

مؤخر الذکر تاویل پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ نبوت تو ایک باطنی شے ہے' اس کے بارے میں تو یہ تاویل درست ہے' لیکن کتاب تو ایک ظاہری چیز ہے' اس کے بارے میں یہ تاویل کیسے درست ہو سکتی ہے؟ اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کو انجیل اس وقت دی گئی جب آپ انجیل کے پیغام کو پیش کرنے کے قابل ہوئے اور دعوت و تبلیغ کا سلسلہ آپ نے شروع کیا۔ اس لئے دونوں باتوں کے اعلان کی پہلی تاویل ہی معقول کہی جا سکتی ہے۔

بدءالوحی کی روایت پر اعتراض اور اس کا جواب

دہلی کے ایک مذہبی اجتماع میں امامیہ فرقہ کے مشہور مقرر فیروز حیدر صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پیدائشی نبی تھے' پھر بخاری کی یہ حدیث پیش کی کہ جب آپؐ پر غار حرا میں وحی کا آغاز ہوا تو اس سے آپ پر کپکپی طاری ہو گئی اور آپ نے کہا "زَمِّلُوْنِی' زَمِّلُوْنِی" (مجھے چادر اڑھاؤ' چادر اڑھاؤ)۔ پھر کہا کہ "یہ روایت یہودیوں کی خودساختہ ہے' بھلا نبی ورسول کو وحی کے نزول سے بخار چڑھنے کا کیا مطلب ہے؟"۔

© rasailojaraid.com

بخاری شریف کی یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے۔ آپ ؓ وحی کے نزول کے وقت موجود نہیں تھیں۔ حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا اس وقت آپ کی حرم تھیں، لیکن حضرت عائشہ نے جو حالات بیان کئے وہ حضور ﷺ سے سنے ہوئے تھے۔ آپ کی روایت میں ہے: "یَرجُفُ فُوَادُہ" "آپ ؐ کا دل کانپ رہا تھا"۔۔۔ آپ ؐ نے فرمایا: "زَمِّلُونی، زَمِّلُونِی" (مجھ پر چادر ڈال دو، مجھے چادر اڑھا دو) "فزَمَّلُوہُ حتّٰی ذَھَبَ عنہُ الرَّوعُ" (پس لوگوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی، یہاں تک کہ آپ ؐ کا خوف دور ہو گیا)۔ پھر حضرت خدیجہ ؓ کو آپ ؐ نے واقعہ سنایا اور فرمایا: "لَقَد خَشِیتُ علٰی نَفسِی" (مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہوا)۔۔۔ یہ بات آپ ؐ نے اس بات پر فرمائی ہو گی کہ جبریل امین نے آپ ؐ کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچا۔۔۔ اور تین دفعہ بھینچا۔

امام بخاری نے اس روایت کے بعد دوسری روایت حضرت جابر بن عبداللہ کی نقل فرمائی۔ اس میں ہے کہ فرشتہ وحی کو ان کی پُر جلال صورت میں دکھایا گیا۔ آپ نے فرمایا: میں چلا جا رہا تھا کہ ایک آواز سنائی دی، میں نے آسمان کی طرف دیکھا،

فَاِذَا المَلَکُ الَّذِی جَاءَنِی بِحِرَاءَ جَالِسٌ عَلٰی کُرسِیٍّ بَینَ السَّمَاءِ وَالارضِ فَرُعِبتُ مِنہُ

"تو یہ دیکھا کہ جو فرشتہ حرا میں میرے پاس آیا تھا وہ ایک کرسی پر بیٹھا ہے جو آسمان و زمین کے درمیان بچھی ہوئی ہے، تو میں نے اس سے خوف محسوس کیا"۔

پہلی وحی کے چند روز بعد آپ کو یہ روحانی مشاہدہ کرایا گیا۔ اس مشاہدہ کے بعد بھی آپ ؐ نے گھر والوں سے وہی فرمایا جو پہلے مشاہدہ میں فرمایا تھا: "زَمِّلُونِی، زَمِّلُونِی"۔

اس سے امام بخاری کی فراست ظاہر ہوتی ہے، وہ سمجھ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک فرقہ حضرت عائشہ ؓ کے راوی ہونے کی وجہ سے اس روایت سے انکار کرے، اس لئے دوسری روایت حضرت جابر ؓ سے نقل کر دی۔ دونوں موقعوں پر آپ ان مشاہدات سے متأثر ہوئے، اور یہ تأثر، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، دونوں حالتوں کے فرق کی وجہ سے تھا۔ غارِ حرا کی ابتدائی وحی کے بعد بھی، متعدد صحیح روایات سے ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب بھی وحی نازل ہوئی آپ پر اس کا تاثر دیکھا گیا۔ کبھی ایسا ہوا کہ

© rasailojaraid.com

ادھر قلبِ مبارک پر وحی کا نزول ہوا اور ادھر آپ کی مبارک پیشانی سے موتیوں کی طرح پسینہ ٹپکنا شروع ہوا۔ کبھی یہ دیکھا گیا کہ آپ اونٹنی پر سوار تھے اور وحی کا نزول شروع ہو گیا تو اونٹنی کے جوڑوں کی ہڈیوں میں سے چرچراہٹ کی آواز آنے لگی۔ کبھی ایسا ہوا کہ کسی اہل خانہ کے زانو پر آپ کا سرِ اقدس تھا اور وحی آگئی تو اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کا زانو بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔ ایسی صورت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ پیش آئی کیونکہ ازواجِ مطہرات میں حضرت صدیقہ جوان العمر ہونے کی وجہ سے طاقتور تھیں۔ مصلحتِ الٰہی نے اس کے لئے آپؐ کا انتخاب کیا تاکہ وحی کے بوجھ کا صحیح اظہار ہو سکے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فطری تأثرات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام انسانوں کی رہنمائی کے لئے تشریف لائے تھے اور اس بنیاد پر ضروری تھا کہ آپؐ کا اسوۂ حسنہ اور نمونہ حیات انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی ہدایت کے لئے مکمل نمونہ ہو۔ آپ اگر اہل غیب کی ہدایت کے لئے تشریف لاتے تو اور بات تھی، مگر آپ اہل اسباب کی ہدایت کے لئے تشریف لائے، اس لئے آپ کی زندگی میں فطری تاثرات کا ہونا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یقین دلایا تھا :

﴿وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ : ۶۸)

"(اے نبی!) اللہ تعالیٰ لوگوں کے ہاتھوں ہلاکت سے (اَنْ یَقْتُلُوْكَ : جلالین، ص ۱۰۴) آپ کو محفوظ رکھے گا"۔

حضور ﷺ اس یقین دہانی کے باوجود میدان جہاد میں ہتھیار بند ہو کر تشریف لے جاتے تھے اور غزوۂ احد میں آپؐ کے جسم اقدس پر دو عدد آہنی زرہیں تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے برائیوں سے آپ کی حفاظت کا بھی اعلان کیا تھا :

﴿لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ (الفتح : ۱)

اللہ تعالیٰ آپ کو خوشخبری دیتا ہے کہ آپکو گناہوں سے مکمل طور پر محفوظ رکھے گا۔ سورۃ الفتح کی یہ مشہور آیت ہے اور اس جگہ مغفرت کے اعلان کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں، لیکن میں اس تاویل کو ترجیح دیتا ہوں کہ اس جگہ "غَفَرَ" حفاظت کے معنی میں آیا ہے۔

© rasailojaraid.com

عربی میں "مِغْفَر" لوہے کے خود کو کہا جاتا ہے جو سر کی حفاظت کرتا ہے "غَفِیرَۃ" ڈھکنے کو کہا جاتا ہے جو برتن کے کھانے کی حفاظت کرتا ہے "غفارت" کے معنی رات کو پہرہ دینے کے ہیں جو چوروں سے حفاظت کے لئے ہوتا ہے۔ اس یقین دہانی کے باوجود دوسری طرف آپ کو استغفار کرنے کا حکم دیا گیا ہے: ﴿فَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ﴾ (محمد: ۹) اور آپ اس حکم کی تعمیل میں دن میں ستر ستر دفعہ استغفار کرتے تھے۔ یہ اس لئے تاکہ آپ کی زندگی میں امت کے لئے استغفار کرنے کا نمونہ موجود ہو۔

آپ ﷺ کی عصمت شیطانی وسوسوں اور اس کی اغواکاریوں کی طرف سے بھی تھی، مگر اسی کے ساتھ آپ کو ہدایت کی گئی تھی:

﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ﴾

(النحل: ۹۸)

اور آپ استعاذہ کرتے تھے اور "اعوذ باللہ" پڑھتے تھے۔

دشمنوں کے حملہ کا خوف ایک فطری تاثر تھا، اسی طرح شیطانی وسوسہ اندازی کا اندیشہ بھی ایک فطری احساس تھا اور آپؐ پر یہ دونوں تاثرات پیدا ہوتے تھے۔

فطری تاثرات، صوفیاء کے ہاں

شیخ المشائخ حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ نے صبر اور رضا پر گفتگو کرتے ہوئے دونوں کے درمیان فرق بیان فرمایا:

"صبر یہ ہے کہ تکلیف و مصیبت کو برداشت کرے اور اس کی شکایت زبان پر نہ لائے، اور رضا یہ ہے کہ مصیبت آئے تو اس پر اسے ناگواری کا احساس بھی نہ ہو، جیسے کہ مصیبت آئی نہ ہو"۔

پھر شیخؒ نے علماءِ عقل (متکلمین) کا نظریہ بیان کیا:

"متکلمین اور اہل کلام رضا کے اس مفہوم سے اتفاق نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ مصیبت آئے اور اس کا احساس نہ ہو، یہ فطرت انسانی کے خلاف ہے"۔

اس کے بعد شیخ علیہ الرحمہ نے ایک مثال بیان کی اور فرمایا:

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی راہ گیر کے پیر میں کانٹا چبھ جاتا ہے اور خون بہنے لگتا، مگر

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

اس راہ گیر کو جلدی جانے کی دھن میں اس تکلیف کا خیال تک نہیں آتا اور بعد میں اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے پیر میں تکلیف ہے۔ تو اگر جسمانی مشغولیت تکلیف سے بے خبر کر سکتی ہے تو کیا یادِ الٰہی کی قلبی اور روحانی مشغولیت تکلیف و مصیبت سے بے خبر نہیں رکھ سکتی؟"۔

غور سے دیکھا جائے تو شیخ نے علماء کلام کے نظریہ کی تردید نہیں کی' بلکہ اپنے نظریئے کی تشریح کر کے یہ بتایا ہے کہ تکلیف کا احساس ایک فطری امر ضرور ہے' لیکن اس فطری احساس و تاثر کو مشغولیت اور محویت اور استغراق کی کیفیت مغلوب کر دیتی ہے۔ فطری احساس کا پیدا ہونا فطرت کے ساتھ لگا ہوا ہے' البتہ جب اس احساس پر یادِ حق کا جذبہ غالب آجاتا ہے تو پھر وہ احساس فطری دب جاتا ہے۔ میر مہدی مجروح کہتے ہیں ؎

کس کو معلوم ' جان کب نکلی
محو تھے ہم تو یادِ جاناں میں

فطری تاثرات کے معاملہ میں اگر شیخ علیہ الرحمہ کی اس تشریح کو سمجھ لیا جائے تو پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک کے بعض اہم گوشوں کی تعبیر کے بارے میں جو الجھنیں اہل علم کو پریشان کرتی ہیں اور ان کی وجہ سے اہل علم کے اندر اختلافات پیدا ہوتے ہیں' وہ نہ ہوں۔

اسلام دینِ فطرت' حضورؐ رسولِ فطرت

اسلام دینِ فطرت ہے اور دینِ فطرت کے ہادی بھی رسولِ فطرت ہیں۔ آپ کا اسوۂ حسنہ انسانی برادری کے لئے مکمل نمونہ ہے۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا: ۲۹)

"ہم نے تو (اے رسول ﷺ) آپ کو تمام انسانوں (کی ہدایت) کے لئے (کافی اور مکمل نمونہ ہدایت یعنی) بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے"۔

یہ زندگی اسباب پر قائم ہے' انسانی فطرت اسباب ظاہری سے متاثر ہوتی ہے۔ یہ تاثر اس ذاتِ اقدس کے لئے بھی ضروری تھا جو اہل اسباب کی رہنمائی کے لئے بھیجی گئی تھی' ورنہ اس کی حیاتِ طیبہ اہل اسباب کے لئے مکمل نمونہ نہیں بن سکتی تھی۔

© rasailojaraid.com

روایتی حیثیت سے اس کا جواب

متذکرہ بالا حدیث پر مذکورہ بالا اعتراض کا روایتی حیثیت سے جواب یہ ہے کہ محدثین اہل سنت کا یہ اصول ہے کہ "اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عَدُوْل" یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات نقل کرنے میں اور آپ کے اقوال نقل کرنے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عادل ہیں، ثقہ ہیں، معتبر ہیں۔ اور صوفیاء اہل سنت کا یہ اصول ہے جو حضرت شیخ المشائخ علیہ الرحمہ نے بیان فرمایا : "طبقۃُ الصحابۃِ، طبقۃُ العلمِ وَالمُشاھَدَۃ"۔ حضرت شیخ نے امتِ مسلمہ کو چھ طبقوں میں تقسیم کیا ہے اور صحابہ کرام کے طبقہ کو طبقہ اولیٰ قرار دے کر اسے علم و مشاہدہ کا دور کہا ہے۔ شیخ کا مطلب یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام کو براہ راست سینہ نبوت اور مشکوٰۃِ وحی سے جو علم حاصل ہوا وہ مشاہدہ و تحقیقات کے درجہ کا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس طبقہ کا علم "عین الیقین" یعنی مشاہدہ کے درجہ کا ہو اس کی نقل و روایت کو تسلیم نہ کرنا ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔

واضح رہے کہ یہ ان روایات کے بارے میں ہے جن کو نہایت سخت تنقیدی اصولوں کے مطابق منتخب کیا گیا ہے اور صحاح کی روایات کا یہی درجہ ہے۔ راویانِ احادیث کے حالات کی چھان بین کے لئے محدثین اہل تحقیق نے جو تحقیقی کاوش کی ہے اس کاوش کا نام فنِ اسماء الرجال ہے اور اہل مغرب دانشوروں نے تسلیم کیا ہے کہ اس فن کو وجود میں لانے کے لئے محدثین نے جو علمی کاوش کی ہے اس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی۔

اس ضمن میں ایک مثال جماعت صحابہؓ میں آپؐ کی زوجہ مطہرہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی ہے۔ حضرت ماریہؓ ایک مصری قبطی کنیز تھیں جو مصر کے حکمران نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ کی تھی، آپؐ نے ماریہ کو اپنے حرم محترم میں داخل کر کے انہیں امّہات المومنین کے اعزاز سے نوازا۔ حضرت ماریہ کے بطن سے آخر عمر میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ ابراہیم چھ مہینے کے بعد حضور کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ایک روز حضورؐ نے حضرت ماریہ قبطیہ کو دیکھا کہ وہ اپنے بچے کی یاد میں مغموم بیٹھی ہیں، آپ نے فرمایا : ماریہ، ابراہیم کی جدائی

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

© rasailojaraid.com